حضرت العلام مولانا حافظ محمد صاحب

دوام حدیث

حدیث کے ماننے سے قرآن پر عمل کرنے میں خلل واقع نہیں ہوتا

صرف صحیح اور غیر صحیح کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے مختلف معیار پیش کیے گئے ہیں۔ اگر سب معیاروں سے کام لے کر احادیث صحیحہ کو لیا جاوے تو اس کے بعد منکرین حدیث یہی کہیں گے کہ یہ حدیثیں فروعی قوانین ہیں جو بہ تقاضائے زمانہ مقرر کیے گئے مگر اس بات پر کوئی دلیل بھی قائم کرنی پڑے گی خواہ عقلی ہو یا نقلی۔ کہ یہ قوانین اس زمانہ کے حالات کے مطابق تھے اور اب زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں اور یہ قوانین حالات کے مطابق نہیں۔ اگر قوانین اس قسم کے ہوں تو ہر زمانہ کے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکیں تو بدلنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ قوانین اس زمانہ کے حالات کے مطابق نہیں تو رد و بدل کی آپ کے ہاں ضرورت ہوگی مگر اس کے لیے خلافت راشدہ کی طرح حکومت کے قائم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جب تک اس قسم کی حکومت قائم نہ ہو اس وقت تک تو یہی احکام نافذ رہیں گے۔ اگر اس قسم کی حکومت قائم ہو جائے اور حکومت بھی ان احکام پر مہر ثبت کر دے تو پھر بھی وہ احکام قائم رہیں گے۔

ان تمام صورتوں میں یہ احکام چونکہ قرآنی اصول سے نافذ ہیں۔ ان پر عمل کرنا قرآن پر عمل کرنے کے مترادف ہوگا۔ اور حدیثوں پر عمل کرنے سے قرآن میں خلل پیدا نہیں ہوگا جب آپ یہ مانتے ہیں کہ حدیثی احکام کے متعلق یہ کھوج لگانا کہ وہ وقتی تقاضا کا ساتھ

دیتے ہیں یا نہیں، اسی حکومت کا کام ہے جو خلافتِ راشدہ کے طور پر قائم ہو تو میرا خیال ہے اگر حدیثوں کے متعلق یہ سوچا کہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، یہ حدیث عقل کے موافق ہے یا نہیں، اس حدیث سے شانِ رسول کی تنقیص ہوتی ہے یا نہیں) بھی اسی حکومت کے فرائض میں داخل کریں تو بہتر ہو گا۔ کیوں کہ کسی حدیث کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ قرآن کے موافق ہے یا مخالف۔ عقل کے منافی ہے یا مؤید یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے کم ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ محدثین اور منکرین حدیث میں مختلف فیہ ہے۔ محدثین ان احادیث کو قرآن، عقل اور شانِ رسول کے موافق سمجھتے ہیں اور آپ خلاف خیال کرتے ہیں۔ اس لیے کم از کم آپ کو تو چاہیے کہ حکومت کے فیصلے کی انتظار کریں اور اپنی تحریرات کو جواب تک لکھی جا چکی ہیں واپس لے لیں۔ صرف احادیث کی صحت وضعف کے متعلق جو محدثین کی روش ہے اسی پر اکتفا کریں اور فتنہ نہ ڈالیں اور اپنی انفرادی رائے سے تفریق سے بچیں۔

قرآن وحدیث میں بلحاظ دوام اور عدم دوام کے کوئی فرق نہیں ہے!

منکرین فرق کرتے ہیں اور اس فرق میں عبادات اور معاملات دونوں کو ایک ہی صف میں رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں جو مسئلہ قرآن میں ہو خواہ عبادات کا یا معاملات کا اسی قدر اصلی ہے جو قرآن میں ہے باقی تفصیل جو حدیث میں ہے خواہ عبادات میں ہو یا معاملات میں، وقتی ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے خود جزئیات متعین نہیں کیں بلکہ اصولی احکام تک اکتفا کیا ہے۔ اس سے مقصود ہی یہ تھا کہ وہ اصول تو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی جزئیات میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے پیش نظر ردوبدل ہو سکتا ہے" (مقام حدیث ص۴۲۰)

یہاں ہم چاہتے ہیں کہ عبادات اور معاملات کی چند مثالیں بیان کریں:۔

مثال اول

وضوء قرآن مجید سورہ مائدہ میں وضوء کا ذکر ہے جس میں ایک تو منہ دھونے کا ذکر ہے دوم ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونے کا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ کہنیاں کہاں تک دھوئی جائیں۔ تیسرا سر کے مسح کا ذکر ہے اور یہ نہیں ذکر کیا کہ پانی لے کر مسح کرنا ہے یا بدوں پانی کے مسح کیا جاوے کیونکہ لغت میں مسح صرف ہاتھ پھیرنے کو کہتے ہیں۔ پھر پاؤں کا ذکر ہے ٹخنوں تک دھونے اور مسح کرنے کا۔ دونوں کا احتمال ہے۔ شیعہ مسح کی طرف چلے گئے اور اہل سنت نے دھونا اختیار کیا۔

اب حدیث کو دیکھو کہ حدیث میں وضو کا طریق اس طرح ہے۔ پہلے بسم اللہ کہے پھر دونوں ہتھیلیوں کو دھوئے۔ پھر کلی کرے۔ پھر ناک میں پانی ڈال کر جھاڑ دے۔ پھر چہرہ دھوئے اور داڑھی کا خلال کرے۔ پھر کہنیوں سمیت ہاتھ دھوئے۔ پھر پانی لے کر دونوں ہاتھ سے مسح کرے۔ پھر کانوں کے اندر باہر مسح کرے۔ پھر پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھو ڈالے۔ کم از کم ایک بار کرے یا تین تین بار کرے۔

اب منکرین حدیث سے سوال ہے۔ اگر آج کل وضو میں ردوبدل کیا جائے گا تو اس کی ترکیب کیا ہوگی اور سابق ترکیب زمانے کے اعتبار سے کیا ردوبدل ہوگا اور مسح میں پانی لیا جائے گا یا نہیں۔ اسی طرح پاؤں کے دھونے یا مسح کرنے میں کس کو ترجیح ہوگی۔ زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق جواب دیا جائے۔ یہ جواب کافی نہیں کہ جو حدیث میں ہے فرض ہے باقی سنت۔ کیونکہ یہ تو آگے حنفیہ نے سمجھا ہی ہے۔ اسی طرح مسح میں پانی کے لینے کی ضرورت بھی بیان فرمائیں یا اسی طرح مسح تجویز کریں۔ جواب میں اقتضاآت زمانہ کا ضرور ذکر ہونا چاہیئے تاکہ ہم بھی سمجھ سکیں کہ واقعی قرآن وسنت کے احکام میں بلحاظ اقتضاء زمانہ کے تغیر اور دوام کا دائمی فرق ہے۔

دوسری مثال

وضو کے ٹوٹنے میں قرآن صرف دو چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک غائط جنگل سے آنا۔ دوم عورتوں سے ملامسہ کرنا۔ پہلے تو ان دونوں کا مطلب قرآن ہی سے بیان کرنا

چاہیے یا ایسی لغت سے جو حدیث سے بڑھ کر معتبر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں وضاعین اور کذابین نے ایک لفظ کا معنے بناکر قرآن میں داخل کر دیا ہو۔ پھر جنگل سے آنا اگر پاخانہ کرنے سے عبارت ہے یعنی کنایہ ہے تو کیا اس میں پیشاب کرنا اور گوز مارنا بھی داخل ہے یا نہیں۔

حدیث سے تو ثابت ہے کہ وضو، پاخانہ، پیشاب اور ہوا کے خارج ہونے، مذی، ودی، منی کے نکلنے، نیند آنے وغیرہ وغیرہ اشیاء سے ٹوٹ جاتا ہے۔

اب آپ فرمائیں۔ قرآنی احکام اور حدیثی احکام میں کیا فرق ہے۔ کیا حدیثی احکام وقتی تھے اور قرآن کے دائمی۔ ان دونوں میں بلحاظ اقتضاء زمانہ کے کیا فرق ہے۔ اگر کچھ فرق کر سکیں گے تو آپ کی بات سنی جاسکتی ہے ورنہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ آپ نے اقتضاآت کا فرق محض دفع الوقتی کے لیے بنایا ہے۔

تیسری مثال۔۔اذان

قرآن میں ندالصلوٰۃ یا ندا الی الصلوٰۃ یعنی نماز کے لیے پکارنا یا نماز کی طرف پکارنا ہے۔ یہ بھی قرآن مجید میں بطور شرط کے ذکر کیا ہے مگر حدیث میں اس کی وہی صورت ہے جو روزمرہ مؤذن مسجدوں میں اذان کہتا ہے۔ اگر آپ کے حسب منشا حکومت قائم ہو جائے تو آپ اس زمانہ کے اقتضاء زمانہ کے مطابق کیا کانٹ چھانٹ کریں گے صرف نماز کی طرف آؤ کے لفظ چھوڑ کر باقی میں کونسی ایسی ترمیم کریں گے جس میں زمانہ کے اقتضاآت شامل ہوں۔ لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو یہاں نہ لائیں کیوں کہ وہ حقیقت اذان سے خارج ہے صرف آواز بلند کرنے کے لیے، اور یہ جائز ہے۔

چوتھی مثال

نماز کے متعلق قرآن صرف بار بار یہی کہتا ہے کہ نماز پڑھو، نماز پڑھو۔ اس کا طریقہ کسی جگہ نہیں بتایا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ نماز کے وقت وضو کرلو، غسل کرلو۔ مختلف مقامات میں مندرجہ ذیل امور مذکور ہیں۔ قیام رکوع، سجود، قراءت قرآن، تسبیح، حمد، ایک جگہ صلاۃ خوف میں سماحت کا ذکر ہے۔ وہ بھی ضمناً۔ ایک جگہ یہ بھی بتایا ہے وَاِذَا کُنْتَ

مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو) اور صلاۃ خوف میں ضمناً اس چیز کا ذکر ہے کہ جب سجدہ کر لیں تو چلے جائیں یعنی سجدے پر نماز ختم ہو جاتی ہے۔ مگر کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ نماز میں قیام اور رکوع ہونا چاہیے۔ صرف قیام کا ذکر ہے اور قیام میں قرآن پڑھنے کا بھی ذکر ہے۔ نہ ابتداء میں تکبیر کا ذکر ہے۔ نہ اخیر میں سلام کا ذکر ہے مگر حدیث میں رکعت کی ترتیب اس طرح ہے:۔

پہلے تکبیر تحریمہ۔ منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے۔ پھر دعاء استفتاح مسنون اور مستحب ہے۔ پھر فاتحہ لازمی ہے اور اس کے بعد سورت کا جوڑ بھی باقی ہے۔ پھر تکبیر کہہ کر رکوع کیا جاتا ہے۔ رکوع میں ہاتھ گھٹنوں پر ہوتے ہیں۔ پھر سر اٹھاتا ہوا سمع اللہ لمن حمدہ کہے۔ پھر ربنا لك الحمد کہے پھر سجدہ میں جاتا ہوا اللہ اکبر کہے اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھے۔ پھر اللہ اکبر کہتا ہوا بیٹھ جائے۔ دعا پڑھ کر پھر دوسرا سجدہ تکبیر کے ساتھ کرے اور سابق تسبیح پڑھے۔ پھر تکبیر کے ساتھ کھڑا ہو جائے یہ ترکیب ہے نماز کی۔

حدیث میں اسی طرح بعض نمازوں میں تین رکعت اور بعض نمازوں میں دو اور بعض میں چار ہیں۔ نماز تکبیر سے شروع اور سلام پر ختم ہوتی ہے۔

اب آپ ہی بتائیں کہ یہ نماز جس میں قرآن کے منتشر اجزاء کو جمع کیا گیا ہے اور خاص ترتیب رکھی گئی ہے۔ پھر اللہ اکبر کو بار بار دہرایا گیا۔ قبلہ رو ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے حالانکہ قرآن مجید میں قبلہ رو ہونا نماز کے لیے کوئی شرط نہیں۔ بلکہ قبلہ کا مسئلہ ایک فروعی قرار دیا گیا ہے اور اس کو نیکی کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے اور جماعت کا صرف ایک جگہ ضمناً ذکر ہے اور ایک جگہ رکوع میں رکوع کرنے والوں کے ساتھ شمولیت کا ذکر ہے۔

اب یہ بتایئے کہ آج کل زمانہ کے اقتضاآت کیا ہیں کہ نماز میں قرآنی امور سے زائد میں تبدیل کی جائے اور صف بندی کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ عورت مرد اکٹھی نماز پڑھیں یا الگ الگ۔ اس کی دلیل اور زمانے کے اقتضاآت کی بنا پر مخلوط تعلیم کی طرح

مساوات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھلے طور پر اپنا عندیہ بیان کریں ورنہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ آپ صرف تبدیلی تبدیلی کا لفظ گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اگر سارے اسلام میں آپ کو دو چار باتیں ایسی ہاتھ آگئیں کہ آپ کی عقل وہاں شل ہوگئی۔ آپ اس بنا پر ان کو زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق نہیں سمجھتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام دین کو خراب کرنے کے لیے آپ اٹھ کھڑے ہوں۔ آپ کو تعمیری کام کرنا چاہیئے نہ تخریبی۔

پانچویں مثال

قرآن مجید نے نکاح کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ محصنین غیر مسافحین۔ پانی گرانا۔ زنا کرنا یہ مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اپنے آپ کو بچانے محفوظ رکھنے کے لیے عورت کو قبضے میں لاتے محرمات سے نہ ہو۔ مال لے کر اس کی تلاش کرے مگر اس کے سوا اور کوئی شرط بیان نہیں کی۔

حدیث میں ہے کہ عورت کے ولی کی ضرورت ہے۔ اگر ولی اور عورت میں اختلاف ہو تو حکومت کی طرف رجوع کیا جاوے مگر ولی عورت کو مجبور نہیں کر سکتا اور کم از کم دو گواہ ہونے چاہییں۔ دونوں راضی ہوں۔ ایجاب و قبول سے نکاح ہو سکتا ہے۔

اب قرآن و حدیث میں جو فرق ہے۔ وہ یہی ہے کہ قرآن ولی کو نکاح کی شرط قرار نہیں دیتا۔ نہ گواہوں کا ذکر ہے۔ صرف جبر سے روکتا ہے۔ اگر ایک مرد ایک عورت دائمی تعلق قائم کرنے کے لیے جمع ہو جائیں اور ان میں کوئی ایجاب و قبول نہ ہو۔ نہ گواہ ہوں تو قرآن کے بیان کے مطابق آپ اس کو کیا کہیں گے اور حدیثوں کو دقتی کہنے کی آپ کے پاس کیا دلیل ہوگی۔ بلکہ قرآن میں نکاح کے دائمی ہونے کا بھی صراحۃً ذکر نہیں۔ صرف حدیث میں بیان ہے آپ کس طرح ترمیم کریں گے۔

یہ چند مثالیں غور و فکر کے لیے ہیں تاکہ حدیثی و قرآنی مسائل میں دوام اور عدم دوام کی صورت پر غور کیا جائے۔

عبادت اور معاملات میں فرق

اسلامی نظام میں عبادات کا تعلق معاملات سے ہے۔ عبدیت (عبودیت عبادت) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت اور محکومی۔ یہ تصور کہ عبادت کا مفہوم خدا کی پرستش (پوجا پاٹ) ہے۔ مذہب کا پیدا کردہ ہے دین کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات "مذہب پرست" لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ "عبادت" کس طرح معاملات کی دنیا میں داخل الذکر ہے .... یہی وہ الجھن تھی جسے قوم شعیب نے حضرت شعیب کے سامنے اس تنقیدی انداز میں پیش کیا جب کہا تھا:۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱: ۸۷)

انہوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ بھی حکم دیتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت، ہمارے آبار کرتے تھے اور ہم اپنا مال و دولت اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔

وہ سمجھتے تھے کہ نماز ایک عبادت ہے یعنی خدا کی پرستش۔ اسے اس بات سے کیا تعلق کہ ہم اپنا معاشی نظام کس قسم کا قائم کریں۔ عبادات کو معاملات سے کیا واسطہ (۱۷- ص ۴۱۸)

عبارتِ مذکورہ میں چند باتیں ذکر کی گئی ہیں:۔

۱- عبادت کا تعلق براہِ راست معاملات سے بھی ہے۔

۲- کیونکہ عبد عبودیت عبادت کے معنی میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومی کے ہے۔

۳- یہ تصور کہ عبادت کا مفہوم خدا کی پرستش (پوجا پاٹ) سے مذہب کا پیدا کردہ ہے، دین کا نہیں۔

۴- قومِ شعیب نے جو حضرت شعیب کو کہا کہ تیری صلوٰۃ تجھے الخ ان کا مطلب یہی تھا کہ

نماز ایک عبادت ہے یعنی خدا کی پرستش اسے اس بات سے کیا تعلق کہ ہم اپنا معاشی نظام کس قسم کا قائم کرتے ہیں. عبادات کو معاملات سے کیا واسطہ؟ یہ تمام باتیں ایک ہی غلطی کا نتیجہ ہیں کہ عبادت کا مفہوم غلط سمجھ کر قوم شعیب کی کلام کی توجیہ اس کے مطابق

عبادت

والعبدیة والعبودیة والعبودة والعبادة الطاعة (قاموس ج ۱ ص ۳۱۱)

عبدیت، عبودیت، عبودیت اور عبادت طاعت کو کہتے ہیں۔

والعبادة اقصی غایة الخضوع والتذلل ومنہ ثوب ذو عبدة اذا کان فی غایة الصفاقة وقوة النسج ولذالک لم تستعمل الا فی الخضوع للہ تعالیٰ لانہ المنعم فکان حقیقا باقصی غایة الخضوع

عبادت انتہائی عاجزی اور ذلت کا نام ہے. کپڑے کو جب اچھا بنا ہو اور گاڑھا ہو تو اس کو عبدہ والا کپڑا کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے آگے خضوع کرنے کا نام ہے کیونکہ تمام نعمتوں کا وہی مولیٰ ہے اس لیے اس لائق ہے کہ انتہائی خضوع اس کے آگے کیا جاوے (کشاف ص ۴۹)

قال الراغب العبودیة اظہار التذلل والعبادة ابلغ منہا لانہا غایة التذلل (حاشیہ کشاف للسید الشریف الجرجانی)

راغب نے قرآن کی لغات میں کہا ہے کہ عبودیت عاجزی کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور عبادت کا درجہ اس سے اونچا ہے کیونکہ عبادت انتہا درجہ کی عاجزی کو کہتے ہیں.

والعبادة تجمع اصلین غایة الحب بغایة الذل والخضوع

عبادت میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک کمال محبت دوسری ذلت اور عاجزی (مدارج لابن القیم)

قاموس نے جو عبادت کا معنے کیا ہے وہ پورا معنی نہیں. یہ اسی طرح ہے جیسے

طرح کوئی شخص بنفشہ کے متعلق کہے کہ وہ ایک بوٹی ہے۔ اس سے بنفشہ کی پوری واقفیت نہیں ہوتی۔

جو تعریف صاحب کشاف اور راغبؒ نے کی ہے اس میں قاموس والے معنے سے کچھ زیادہ واقفیت ہوتی ہے۔ ذلت کا لفظ یا اس کا ہم معنے لفظ سب نے لیا ہے۔ اور ذلت کے ساتھ انتہا کا لفظ بھی بڑھایا ہے یعنی انتہائی ذلت کو عبادت کہتے ہیں جس ذلت سے بڑھ کر ذلت نہ ہو۔ جس خضوع سے بڑھ کر خضوع نہ ہو۔ جس پستی سے بڑھ کر کوئی پستی نہ ہو، اس کو عبادت کہتے ہیں۔ ابن قیم نے اس کے ساتھ انتہائی محبت کو بھی بڑھایا ہے یعنی انتہائی خضوع کا نام عبادت نہیں بلکہ ساتھ ساتھ انتہائی محبت کا ہونا بھی ضروری ہے اگر انتہائی محبت نہ ہو تو صرف عاجزی خضوع کو عبادت نہیں کہتے۔

شاہ ولی اللہؒ نے اس پر اور اضافہ کیا ہے کہ:۔

صرف انتہائی تذلل اور انتہائی خضوع عبادت کے لیے کافی نہیں، کیونکہ سجدہ بظاہر پرلے درجہ کی ذلت ہے۔ اس سے بڑھ کر ظاہری افعال میں کوئی خضوع کا درجہ نہیں، پھر بھی مجرد سجدہ خواہ تعظیم کے لیے ہو عبادت نہیں اس لیے انتہائی خضوع کا تعلق صرف ظاہری افعال سے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کے لیے دل کی کیفیت کا شمول ضروری ہے اور اسی وجہ سے ایک ظاہری خضوع خواہ کسی مرتبے میں ہو، قیام ہو، رکوع ہو، سجدہ ہو جب اس میں وہ قلبی کیفیت شامل ہوگی تو وہ انتہائی خضوع بن جائے گا۔ وہ کیفیت یہ ہے کہ جس کے آگے عاجزی اور خضوع کر رہا ہے اس کو غیبی طور پر مشکل کشا اور حاجت روا سمجھے یعنے یہ خیال کرے کہ عالم اسباب سے بالاتر قوت کی وجہ سے یا اپنی قہری شفاعت کی وجہ سے میری حاجت پوری کر سکتا ہے یا اس میں کوئی خاص خدائی صفت کا اعتقاد کرتا ہو۔ اس کے آگے خضوع و تذلل کرے۔

مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے:۔

۱۔ ایک شخص کسی کے آگے اس لیے جھکتا یا عاجزانہ شکل میں کھڑا ہوتا یا سجدہ کرتا ہے۔ کہ اس کی قوت اسباب سے بالاتر ہے۔ یہ میری مشکل دور یا حاجت پوری کرے گا تو اس کے اس جھکنے یا کھڑا ہونے یا سجدہ یا مدح وثنا یا نذر و نیاز ادا کرنے یا رونے اور فریاد کرنے کو عبادت کہیں گے۔

۲۔ ایک شخص مذکورہ بالا کام اس لیے کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے زبردستی منوا سکتا ہے اس کی شفاعت رد نہیں ہو سکتی، اللہ کو ماننے سے چارہ نہیں۔ تو اس کے یہ کام جن کا ذکر ہوا سب عبادت کہلائیں گے۔

۳۔ ایک شخص مذکورہ بالا کام یا اطاعت اس بنا پر کرتا ہے کہ اس میں خدائی صفات ہیں یا ان میں سے کوئی ایک صفت ہے مثلاً یہ اعتقاد رکھنا کہ اس کو شریعت بنانے کا حق ہے یا اس کا حکم جہاں میں نافذ ہے تو اس اعتقاد کے ساتھ اطاعت اور مذکورہ بالا کام سب عبادت کہلائیں گے۔

یہ اعتقاد جس کا ذکر ہوا نہ پایا جاوے تو کوئی خضوع انتہائی درجہ کا نہیں ہوتا۔ پس اعتقاد مذکور کا ہونا عبادت کے پائے جانے کے لیے ضروری ہے۔ صرف اطاعت جس میں مذکورہ بالا اعتقاد نہ ہو) کو عبادت نہیں کہتے۔ کیونکہ قرآن مجید نے جا بجا اپنے سوا دوسروں کی اطاعت کا حکم دیا ہے (اگرچہ دوسروں کی اطاعت میں یہ شرط ہے کہ اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو جیسے اولی الامر کی اطاعت کا حکم قرآن میں موجود ہے) مگر ان کی عبادت کی ممانعت ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور رسول کی عبادت اور اولی الامر کی کرو بلکہ عبادت کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ:۔

لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ (بنی اسرائیل) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو

اس واسطے جو تاموس میں عبادت کا معنی طاعت کا کیا ہے۔ وہ عبادت کا پورا معنی نہیں بلکہ اس کے پورے معنے کا کچھ حصہ ہے۔ پس کسی طاعت یا خضوع کے عبادت بننے کے لیے اعتقاد مذکور کا ہونا ضروری ہے۔ مجرد خضوع اور طاعت عبادت نہیں

طاعت بھی بعض حالات میں خضوع کے لیے ہوتی ہے مگر پھر بھی وہ عبادت نہیں کہلاتی جیساکہ والدین کی طاعت محض ان کے احترام کے لیے ہے۔ یہ اطاعت اگرچہ خضوع ہے مگر عبادت نہیں کیونکہ مجرد تذلل اور خضوع کو عبادت نہیں کہتے بلکہ اس میں یہ ضروری ہے کہ تذلل اور خضوع انتہائی درجہ کا ہے اور کسی خضوع کا انتہائی درجہ کا ہونا اعتقاد مذکور کی وجہ سے ہوتا ہے۔ درحقیقت طاعت کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ وہ اطاعت جو صرف معاہدہ کی بنا پر ہو جیسے مزدور اور کارخانہ دار یا مزدور اور مالک جب ان دونوں کے درمیان محنت اور اس کی اجرت کا معاہدہ ہو جاوے تو اب مزدور کو مالک کی طاعت کرنی پڑتی ہے اگرچہ طاعت عبادت نہیں، کیونکہ یہ طاعت عاجزی نہیں نہ خضوع ہے بلکہ محنت اور اجرت کا آپس میں تبادلہ ہے۔

۲۔ طاعت خضوع کی صورت میں ہو جیسے والدین کی اطاعت یا استاد کی طاعت یا کسی محسن کی اس کے احسان کے بدلہ میں اطاعت۔ یہ طاعت خضوع تو ہے مگر یہ بھی عبادت نہیں کیونکہ انتہائی خضوع نہیں۔

۳۔ وہ اطاعت جو باوجود خضوع اور تذلل کے اعتقاد مذکور کے ساتھ ہو تو عبادت ہے

مرزائیت اور اسلام

علامہ احسان الٰہی ظہیر کے خارا شگاف قلم سے

اردو میں مرزائیت کے اوپر بہترین کتاب

قیمت:۔ صرف ۶ روپے

ادارہ ترجمان السنۃ ۷۔ ایبک روڈ ——— انارکلی لاہور